تمہیں سر کے بل چلنے کو کہیں تو تمہارا فرض ہے کہ سر کے بل چلو۔ تم اتنے ہی میں گھبرا گئیں۔

اندو: آپ مجھ سے وہ کرنے کے لیے کہتی ہیں جو میرے لیے ناممکن ہے۔

جانہوی: چپ رہو۔ میں تمہارے منہ سے ایسی باتیں نہیں سن سکتی۔ مجھے اندیشہ ہو رہا ہے کہ کہیں صوفی کی آزاد خیالی کا جادو تمہارے اوپر بھی تو نہیں چل گیا؟

اندو نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ خوف تھا کہ میرے منہ سے کوئی ایسا لفظ نہ نکل پڑے جس سے اماں کے دل میں یہ شک اور بھی جگہ پکڑ لے تو بے چاری صوفی کا یہاں رہنا ہی مشکل ہو جائے۔ وہ راستہ بھر یک دم خاموش بیٹھی رہی۔ جب گاڑی پھر مکان پر پہنچی اور وہ اتر کر اپنے کمرہ کی طرف جانے لگی تو جانہوی نے کہا۔ ''بیٹی! تم سے ہاتھ جوڑ کر کہتی ہوں۔ مہیندر سے اس بارے میں اب ایک لفظ بھی نہ کہنا۔ نہیں تو مجھے بہت رنج ہوگا۔''

اندو نے ماں کو کچھ اس انداز سے دیکھا جس سے اس کی خستہ دلی کا اظہار ہوتا تھا۔ پھر اپنے کمرہ میں چلی گئی۔ خوش قسمتی سے مہیندر کما رکھانا کھا کر سیدھے باہر چلے گئے ورنہ اندو کے لیے اپنے خیالات کا روکنا بہت مشکل ہو جاتا۔ اس کے دل میں رہ رہ کر اس امر کی تحریک ہوتی تھی کہ چل کر صوفیہ سے معافی مانگوں۔ صاف صاف کہہ دوں۔ ''بہن میرا کچھ بس نہیں ہے۔ میں کہنے کو رانی ہوں مگر دراصل مجھے اس قدر آزادی بھی نصیب نہیں جس قدر کہ میرے گھر کے مہریوں کو ہے۔'' لیکن یہ سوچ کر رہ جاتی کہ شوہر کی غیبت کرنا میرے مذہبی فرض کے خلاف ہے۔ میں صوفی کی نگاہوں میں گر جاؤں گی۔ وہ سمجھے گی اس میں ذرا بھی خودداری نہیں ہے۔

نو بجے ونے سنگھ اس سے ملنے آئے۔ وہ دماغی ہیجان کی حالت میں بیٹھی ہوئی اپنے صندوق میں سے صوفی کے لیے خریدے ہوئے کپڑے نکال رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ انہیں اس کے پاس کیسے بھیجوں۔ خود جانے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ ونے

سنگھ کو دیکھ کر بولی۔ ''کیوں ونے! اگر تمہاری استری اپنی کسی سہیلی کو چند دنوں کے لیے اپنے ساتھ رکھنا چاہے تو تم اسے منع کر دو گے یا خوش ہو گے؟''

ونے: میرے سامنے یہ سوال کبھی پیدا ہی نہ ہو گا۔ اس لیے میں اس خیال سے اپنے دماغ کو تکلیف نہیں دینا چاہتا۔

اندو: یہ سوال تو پہلے ہی پیدا ہو چکا ہے۔

ونے: بہن! مجھے تمہاری باتوں سے خوف معلوم ہوتا ہے۔

اندو: اس لیے کہ تم اپنے کو دھوکا دے رہے ہو لیکن دراصل تم اس سے بہت گہرے پانی میں ہو جتنا تم سمجھتے ہو۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ تمہارا کئی کئی روز تک گھر میں نہ آنا۔ ہر وقت سیوا سمتی کے کاموں میں مشغول رہنا۔ مس صوفیہ کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھنا۔ اس کے سایہ سے بھاگنا۔ اس ہل چل کو چھپا سکتا ہے جو تمہارے دل میں تیزی کے ساتھ مچی ہوئی ہے؟ لیکن یاد رکھنا کہ اس ہل چل کی آواز ذرا بھی سنائی دے ورنہ اچھا نہ ہو گا۔ صوفیہ تمہارا اس قدر احترام کرتی ہے جتنا کوئی ستی اپنے شوہر کا بھی نہ کرتی ہو گی۔ وہ تم پر عقیدت رکھتی ہے۔ تمہارے ضبط، ایثار اور خدمت کے جذبات نے اس کو فریفتہ بنا دیا ہے، لیکن اگر میں ٹھیک سمجھتی ہوں تو اس کی عقیدت میں عشق کا ذرا بھی شائبہ نہیں۔ اگرچہ تمہیں صلاح دینا بے سود ہے کیونکہ تم اس راستہ کی مشکلات سے خوب واقف ہو، پھر بھی میں تم سے باصرار کہتی ہوں کہ تم کچھ دن کے لیے کہیں چلے جاؤ۔ تب تک شاید صوفی بھی اپنے لیے کوئی نہ کوئی راستہ ڈھونڈ نکالے گی۔ ممکن ہے اس وقت کی ہوشیاری سے دو جانوں کا ستیاناس ہونے سے بچ جائے۔

ونے: بہن! جب تم سب کچھ جانتی ہی ہو تو تم سے کیا چھپاؤں۔ اب میں ہوشیار نہیں بن سکتا۔ ان چار پانچ مہینوں میں میں نے جو روحانی تکلیف برداشت کی ہے، اسے میرا دل ہی جانتا ہے۔ میری عقل بگڑ گئی ہے۔ میں آنکھیں کھلی ہونے پر بھی

گڈھے میں گر رہا ہوں۔ جان بوجھ کر زہر کا پیالہ پی رہا ہوں۔ کوئی رکاوٹ، کوئی دقت، کوئی خوف، اب مجھ کو تباہی سے نہیں بچا سکتا۔ البتہ میں تمہیں اس کا یقین دلاتا ہوں کہ اس آگ کی ایک چنگاری یا ایک لپٹ بھی صوفی تک نہ پہنچے گی۔ میرا سارا بدن جل جائے۔ ہڈیاں تک خاک ہو جائیں، لیکن صوفی کو اس شعلہ کی چمک تک نہ دکھائی دے گی۔ میں نے بھی تہیہ کر لیا ہے کہ جتنی جلد ہو سکے میں یہاں سے چلا جاؤں۔ اپنی حفاظت کے لیے نہیں بلکہ صوفی کی حفاظت کے لیے۔ آہ اس سے تو یہ کہیں بہتر تھا کہ صوفی نے مجھے اسی آگ میں جل جانے دیا ہوتا۔ میرا پردہ ڈھکا رہ جاتا۔ اگر والدہ کو یہ بات معلوم ہوگئی تو ان کی کیا حالت ہوگی۔ اس کے تصور ہی سے میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ بس اب میرے لیے منہ پر سیاہی لگا کر کہیں ڈوب مرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے۔

یہ کہہ کر رونے سنگھ ایک دم باہر چلے گئے۔ اندو ''بیٹھو بیٹھو'' کہتی ہی رہ گئی۔ وہ اس وقت جوش میں اس سے بہت زیادہ کہہ گئے تھے۔ اتنا وہ کہنا چاہتے تھے اور دیر تک بیٹھتے تو نہ جانے اور کیا کیا کہہ جاتے۔ اندو کی حالت اس جاندار کی سی تھی جس کے پیر بندھے ہوں اور سامنے اس کا گھر جل رہا ہو۔ وہ دیکھ رہی تھی یہ آگ سارے گھر کو چلا دے گی۔ رونے کے اونچے اونچے منصوبے، ماں کی بڑی بڑی خواہشیں، باپ کے بڑے بڑے حوصلے سب ملیامیٹ ہو جائیں گے۔ وہ اسی قسم کے رنجیدہ خیالات میں پڑی ہوئی ساری رات کروٹیں بدلتی رہی۔ صبح اٹھی تو دروازہ پر اس کے لیے پالکی کھڑی تھی۔ وہ ماں کے گلے سے لپٹ کر روئی۔ باپ کے قدموں کو آنسوؤں سے دھویا اور گھر سے رخصت ہوئی۔ راستہ میں صوفیہ کا کمرہ پڑتا تھا۔ اندو نے اس کمرہ کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ صوفیہ اٹھ کر دروازہ پر آئی اور آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے اس نے ہاتھ ملایا۔ اندو نے بعجلت ہاتھ چھڑا لیا اور آگے بڑھ گئی۔

صوفیہ اس وقت اس حالت میں تھی جب ایک معمولی ہنسی کی بات، ایک معمولی آنکھوں کا اشارہ، کسی کا اس کو دیکھ کر مسکرا دینا، کسی مہری کا اس کے حکم کی تعمیل میں ایک لمحہ توقف کرنا، ایسی ہزاروں باتیں جو روز ہی گھروں میں ہوتی رہتی ہیں اور جن کی کوئی پروا بھی نہیں کرتا، اس کا دل دکھانے کے لیے کافی ہوسکتی تھیں۔ چوٹ کھایا ہوا عضو معمولی سی ٹھیس بھی نہیں سہہ سکتا۔ پھر اندو کا اسے کچھ کہے بغیر ہی چلا جانا کیوں نہ رنجیدہ ہوتا۔ اندو تو چلی گئی مگر وہ بہت دیر تک اپنے کمرے کے دروازہ پر بت بنی کھڑی سوچتی رہی۔ یہ تحقیر کیوں؟ میں نے ایسا کون سا قصور کیا ہے جس کی مجھے یہ سزا ملی ہے؟ اگر اس کو یہ منظور نہ تھا کہ مجھے ساتھ لے جاتی تو صاف صاف کہہ دینے میں کیا ہرج تھا۔ میں نے اس کے ساتھ جانے کے لیے اصرار تو کیا نہ تھا! کیا میں اتنا بھی نہیں جانتی کہ مصیبت میں کوئی کسی کا ساتھی نہیں ہوتا۔ وہ رانی ہے، اس کی اتنی نوازش کیا کم تھی کہ وہ میرے ساتھ ہنس بول لیا کرتی تھی؟ میں اس کی سہیلی بننے لائق کب تھی؟ کیا مجھے اتنی سمجھ بھی نہ تھی؟ لیکن اس طرح آنکھیں پھیر لینا کون سی شرافت ہے؟ راجہ صاحب نے نہ مانا ہوگا۔ یہ صرف ایک بہانہ ہے۔ راجہ صاحب اتنی سی بات کو کبھی نامنظور نہ کر سکتے۔ اندو نے خود ہی کچھ سوچا ہوگا۔ وہاں بڑے بڑے آدمی آویں گے۔ ان سے اس کا تعارف کیونکر کراؤں گی؟ شاید یہ خیال ہوا ہو کہ کہیں اس کے سامنے میرا رنگ پھیکا نہ پڑ جائے۔ بس یہی بات ہے اگر میں جاہل اور صورت سیرت سے بے بہرہ ہوتی تو وہ مجھے ضرور ساتھ لے جاتی۔ میری بدرنگی سے اس کا رنگ اور چمک اٹھتا میری بدنصیبی!

یہ ابھی دروازہ پر کھڑی ہی تھی کہ جانہوی بیٹی کو رخصت کر کے لوٹیں اور صوفی کے کمرہ میں آ کر بولیں۔ ''بیٹی! میرا قصور معاف کرو۔ میں نے ہی تم کو روک لیا۔ اندو کو برا معلوم ہوا پر کروں کیا؟ وہ تو گئی ہی تم بھی چلی جاتیں تو میرا دن کیسا کٹتا؟ و نے بھی راجپوتانہ جانے کو تیار بیٹھے ہیں۔ میری تو موت ہو جاتی۔ تمہارے رہنے سے میرا دل بہلتا رہے گا۔

سچ کہتی ہوں بیٹی! تم نے میرے اوپر کوئی موہنی منتر پھونک دیا ہے۔''

صوفیہ: آپ کی شرافت ہے جو ایسا کہتی ہیں۔ مجھے رنج یہی ہے کہ اندو نے جاتے وقت مجھ سے ہاتھ بھی نہ ملایا۔

جانہوی: ایسا اس نے کیا تو محض ندامت کی وجہ سے۔ میں تم سے سچ کہتی ہوں ایسی سیدھی سادی لڑکی دنیا میں نہ ہوگی۔ تجھے روک کر میں نے اس کے ساتھ سخت نا اتفاقی کی ہے۔ میری بچی کا وہاں ذرا بھی جی نہیں لگتا۔ مہینہ بھر رہ جاتی ہے تو صحت بگڑ جاتی ہے۔ اتنی بڑی ریاست ہے۔ مہیندر سارا بوجھ اسی کے سر ڈال دیتے ہیں۔ انہیں تو میونسپلٹی ہی سے فرصت نہیں ملتی۔ بیچاری آمدنی اور خرچ کا حساب لکھتے لکھتے گھبرا جاتی ہے۔ پھر حساب کیسا، ایک ایک پیسہ کا مہیندر کو حساب رکھنے کا خبط ہے۔ ذرا سا بھی فرق پڑا تو اس کے سر ہو جاتے ہیں۔ اندو کو اختیار ہے جتنا چاہے خرچ کرے، حساب ضرور رکھے۔ راجہ صاحب کسی کی رو رعایت نہیں کرتے۔ کوئی نوکر ایک پیسہ بھی کھا جائے تو اس کو برطرف کر دیتے ہیں۔ خواہ اس نے ساری عمر ان کی خدمت کی ہو۔ یہاں میں اندو کو کبھی کڑی نگاہ سے بھی نہیں دیکھتی، چاہے وہ گھی کا گھڑا کیوں نہ لڑھکا دے۔ وہاں ذرا ذرا سی بات پر راجہ صاحب کی جھڑکیاں سننی پڑتی ہیں۔ بچی سے بات نہیں برداشت ہو سکتی۔ جواب تو دیتی نہیں (اور یہی ہندو عورت کا دھرم ہے) پر رونے لگتی ہے۔ وہ دیا کی مورت ہے۔ کوئی اس کا سب کچھ کھا جائے لیکن وہ جوں ہی اس کے سامنے آ کر رویا، اس کا دل پگھل گیا۔ صوفی! مجھے بھگوان نے دو بچے دیئے اور دونوں ہی کو دیکھ کر کلیجہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ اندو جتنی نرم دل اور سادہ مزاج ہے۔ وہ نے اتنا ہی مستقل مزاج اور ہمتی ہے۔ تھکنا تو جانتا ہی نہیں۔ معلوم ہوتا ہے دوسروں کی خدمت کرنے کے لیے ہی اس کا جنم ہوا ہے۔ گھر میں کسی ٹہنی کو بھی کوئی شکایت ہوئی وہ سب کام چھوڑ کر اس کی دوا دارو کرنے لگا۔ ایک بار مجھ کو بخار آنے لگا تھا۔ اس لڑکے نے تین ماہ تک دروازہ کا منہ نہیں دیکھا۔ ہر

وقت میرے ہی پاس بیٹھا رہتا۔ کبھی پنکھا جھلتا، کبھی پاؤں سہلاتا، کبھی رامائن اور مہا بھارت پڑھ کر سناتا۔ کتنا ہی کہتی بیٹا! جاؤ گھومو، پھرو۔ آخر یہ لونڈیاں باندیاں کس دن کام آئیں گی۔ ڈاکٹر روز آتے ہیں تم کیوں میرے ساتھ ستی ہوتے ہو، لیکن وہ کسی طرح بھی نہ جاتا۔ اب کچھ دنوں سے سیوا سمتی کا انتظام کر رہا ہے۔ کنور صاحب کو جو سیوا سمتی سے اتنی دلچسپی ہے، وہ ونے ہی کی صحبت کی برکت ہے۔ ورنہ آج سے تین سال بیشتر ان کا سا عیش پسند سارے شہر میں نہ تھا۔ دن میں دو بار حجامت بنتی تھی۔ درجنوں دھوبی اور درزی کپڑے دھونے اور سینے کے لیے نوکر تھے۔ پیرس سے ایک ہوشیار دھوبی کپڑے سنوارنے کے لیے آیا تھا۔ کشمیر اور اٹلی کے باورچی کھانا پکاتے تھے۔ تصویروں کا اتنا شوق تھا کہ کئی بار عمدہ تصاویر خریدنے کے لیے اٹلی تک کا سفر کیا۔ سیر کرنے نکلتے تو مسلح سواروں کی ایک جماعت ساتھ چلتی۔ شکار کھیلنے کی مت تھی۔ مہینوں شکار ہی کھیلتے رہتے۔ کبھی کشمیر، کبھی بیکانیر، کبھی نیپال صرف شکار کھیلنے کی غرض سے جاتے۔ ونے نے ان کی کایا پلٹ کر رکھ دی۔ جنم کا بیراگی ہے۔ پہلے جنم میں ضرور کوئی رشی رہا ہوگا۔

صوفی: آپ کے دل میں خدمت اور اعتقاد کے ایسے بلند جذبات کس طرح پیدا ہوئے؟ یہاں تو عموماً رانیاں عیش پرستی ہی میں محو رہتی ہیں۔

جانہوی: بیٹی! یہ ڈاکٹر گنگولی کی نصیحتوں کے سبب ہوا۔ جب اندو دو سال کی تھی تب میں بیمار پڑی۔ ڈاکٹر گنگولی میرے معالجہ کی غرض سے آئے۔ ضعف قلب کی شکایت تھی۔ طبیعت گھبرایا کرتی۔ گویا کسی نے جادو کر دیا ہو۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے مہا بھارت پڑھ کر سنانا شروع کیا۔ اس میں میرا جی اس قدر لگا کہ کبھی کبھی آدھی رات تک بیٹھی پڑھا کرتی۔ تھک جاتی تو ڈاکٹر صاحب سے پڑھوا کر سنتی۔ پھر تو بہادری کی داستانوں کے پڑھنے کا مجھے ایسا چسکا لگا کہ راجپوتوں کی ایسی کوئی داستان نہیں جو میں نہ پڑھی ہو۔ اسی وقت سے میرے دل میں قومی محبت کا جذبہ پیدا ہوا۔

ایک نئی خواہش پیدا ہوئی۔ کاش میرے بطن سے بھی کوئی ایسا لڑکا جنم لیتا جو بھیم، درگا داس، اور پرتاب کی طرح قوم کا سر اونچا کرتا۔ میں نے عہد کیا کہ لڑکا ہوا تو اس کو ملک وقوم کی فلاح کے لیے وقف کر دوں گی۔ میں ان دنوں تپسیا کرتی ہوئی زمین پر سوتی۔ صرف ایک بار روکھا کھانا کھاتی۔ اپنے برتن تک اپنے ہاتھ سے دھوتی تھی۔ ایک وہ دیویاں تھیں جو قوم کی لاج رکھنے کے لیے جان تک دے دیتی تھیں۔ ایک میں بدنصیب ہوں کہ دنیا و عافیت کے سارے تفکرات سے کنارہ کرتے ہوئے صرف عیش وعشرت میں مبتلا ہوں۔ مجھے اس قومی زوال کو دیکھ کر اپنی عیش پسندی پر شرم آتی تھی۔ خیر ایشور نے میری سن لی۔ تیسرے سال ونے کا جنم ہوا۔ میں نے بچپن سے ہی اس کو سختیاں اٹھانے کا عادی بنانا شروع کیا۔ نہ کبھی گدوں پر سلاتی، نہ کبھی لہریوں اور دائیوں کی گود میں جانے دیتی، نہ کبھی میوے کھانے کو دیتی۔ دس برس کی عمر تک صرف مذہبی داستانوں کے ذریعہ اس کو تعلیم دی گئی۔ اس کے بعد میں نے اس کو ڈاکٹر گنگولی کے سپرد کر دیا۔ مجھے ان پر پورا اعتماد تھا اور مجھ کو فخر ہے کہ ونے نے تعلیم وتربیت کا بار جس شخص پر رکھا، وہ اس کام کے لیے ہر طرح سے اہل تھا۔ ونے روئے زمین کے بیشتر ملکوں کا سفر کر چکا ہے۔ سنسکرت اور ہندوستانی زبانوں کے علاوہ یورپ کی خاص زبانوں سے بھی وہ بخوبی واقف ہے۔ گانے میں اس کو اس قدر مشق ہے کہ اچھے اچھے استاد اس کے سامنے منہ کھولنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ ہمیشہ کمبل بچھا کر زمین پر سوتا ہے اور کمبل ہی اوڑھتا ہے۔ پیدل چلنے میں کئی بار انعام پا چکا ہے۔ ناشتے کے لیے مٹھی بھر چنے، کھانے کے لیے روٹی اور ساگ بس ان کے سوا دنیا کے اور سارے کھانے اس کے لیے ممنوع ہیں۔ بیٹی! میں تجھ سے کہاں تک کہوں، پورا تیاگی ہے۔ اس کے تیاگ کا سب سے عمدہ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے باپ کو بھی تیاگی بننا پڑا۔ جواب بیٹے کے سامنے بوڑھا باپ نفس پرستی کا غلام بنا رہ سکتا ہے؟ میں سمجھتی ہوں کہ عیش وعشرت سے ان کا دل آسودہ ہو گیا اور یہ بہت

اچھا ہوا۔ تیاگی لڑکے کا بھوگی باپ یہ واقعی مضحکہ خیز بات ہوتی۔ وہ کھلے دل سے ونے کے نیک کاموں میں حصہ لیتے ہیں اور میں کہہ سکتی ہوں کہ ان کی اس رغبت و مصروفیت کے بغیر ونے کو کبھی اس قدر کامیابی نہ حاصل ہوتی۔ سیوا سمتی میں اس وقت ایک سو نوجوان ہیں جن میں امیر گھرانوں کے ہیں۔ کنور صاحب کی تمنا ہے کہ سمتی کے ممبران کی پوری تعداد پانچ سو تک بڑھا دی جاوے۔ ڈاکٹر گنگولی اس پیرانہ سالی کے باوجود بھی بڑے حوصلہ اور خوشی کے ساتھ سمتی کا کام کرتے ہیں۔ وہی اس کے منتظم ہیں۔ جب کونسل کے کاموں سے فراغت ملتی ہے تو ہر روز دو ڈھائی گھنٹے نوجوانوں کے سامنے جسمانی علم پر لکچر دیتے ہیں۔ یہاں کی تعلیم پورے تین سالوں میں ختم ہوتی ہے۔ تب خدمتی کام شروع کیا جاتا ہے۔ اب کے بیس نوجوان پاس ہوں گے اور یہ تجویز کیا گیا ہے کہ وہ دو سال تک ہندوستان کا سفر کریں۔ مگر شرط یہ ہے کہ ان کے ساتھ لوٹا، ڈور، دھوتی اور کمبل کے سوا اور کسی قسم کا رخت سفر نہ ہو۔ یہاں تک کہ خرچ کے لیے روپے بھی نہ رکھے جائیں۔ اس سے کئی فائدے ہوں گے۔ نوجوانوں کو مشکلات کا سامنا کرنے کی عادت پڑے گی۔ انہیں ملک کی واقعی حالت کا علم ہوگا۔ نظری زاویہ وسیع ہو جائے گا اور سب سے بڑی بات یہ کہ چال چلن درست اور مضبوط ہوگا۔ استقلال، جرأت، تدبیر اور ارادہ وغیرہ اوصاف کی افزونی ہوگی۔ ونے ان لڑکوں کے ساتھ جا رہا ہے اور میں غرور سے پھولی نہیں سماتی کہ میرا لڑکا قومی فلاح و بہبود کے لیے یہ کام کر رہا ہے اور تم سے سچ کہتی ہوں کہ اگر کوئی ایسا موقع آ پڑے کہ قوم کی بھلائی کے لیے اس کو جان دینا پڑی تو مجھے ذرا بھی رنج نہ ہوگا، رنج تب ہوگا جب میں اس کو دولت و ثروت کے سامنے سر جھکاتے یا حد فرض کے پیچھے قدم رکھتے دیکھوں گی۔ ایشور نہ کرے میں وہ دن دیکھنے کے لیے زندہ رہوں۔ میں نہیں کہہ سکتی کہ کہ اس وقت میرے دل کی کیا حالت ہوگی؟ شاید میں ونے کے خون کی پیاسی ہو جاؤں، شاید میرے ان کمزور ہاتھوں میں اتنی سکت آ

جائے کہ میں اس کا گلا گھونٹ دوں!

یہ کہتے کہتے رانی کے چہرہ پر ایک عجیب رونق نظر آنے لگی۔ اشک آلود آنکھوں میں خودداری کی سرخی جھلکنے لگی۔ صوفیہ حیرت سے رانی کا منہ تاکنے لگی۔ اس نازک جسم میں اس قدر محبت آ گئیں اور بلند حوصلہ دل میں چھپا ہوا ہے، اس کا اسے خیال بھی نہ تھا۔

ذرا دیر بعد رانی نے پھر کہا۔ ''بیٹی! میں جوش میں تم سے اپنے دل کی کتنی ہی باتیں کہہ گئی، پر کیا کروں۔ تمہارے چہرہ پر ایسی دلکش سادگی ہے جو میرے دل کو اپنی طرف بے اختیار کھینچتی ہے۔ اتنے دنوں میں میں نے تم کو خوب پہچان لیا۔ تم اندو نہیں، تم عورت کی شکل و نے ہو۔ کنور صاحب تم پر فریفتہ ہو گئے ہیں۔ گھر آتے ہیں تو تمہاری چرچا ضرور کرتے ہیں۔ اگر مذہبی رکاوٹ نہ ہوتی تو (مسکرا کر) انہوں نے مسٹر سیوک کے پاس و نے کی شادی کا پیغام کبھی کا بھیج دیا ہوتا۔''

صوفیہ کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔ بڑی بڑی پلکیں نیچے کو جھک گئیں اور لبوں پر ایک نہایت خفیف سکون بخش اور دلکش تبسم کی جھلک دکھائی دی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا اور بولی۔ ''آپ مجھے گالیاں دے رہی ہیں۔ میں بھاگ جاؤں گی۔''

رانی: اچھا شرماؤ مت۔ میں یہ ذکر ہی نہ کروں گی۔ میرا تم سے یہی کہنا ہے کہ اب تمہیں یہاں کسی بات میں پس و پیش نہ کرنا چاہیے۔ اندو تمہاری سہیلی تھی۔ تمہارے مزاج سے واقف تھی۔ تمہاری ضروریات کو سمجھتی تھی۔ مجھ میں اتنی تمیز نہیں ہے۔ تم اس گھر کو اپنا گھر سمجھو۔ جس چیز کی ضرورت ہو بلا تامل کہہ دو۔ اپنی مرضی کے موافق کھانا بنوالو۔ جب سیر کرنے کو جی چاہے گاڑی تیار کرالو۔ کسی نوکر کو کہیں بھیجنا چاہو بھیج دو۔ مجھے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ مجھ سے کچھ کہنا ہو تو فوراً چلی آؤ۔ پیشتر سے اطلاع دینے کی ضرورت نہیں۔ یہ کمرہ اگر پسند نہ ہو تو میرے بغل والے کمرے میں چلو جس میں اندو رہتی تھی۔ وہاں جب میرا جی چاہے گا، تم سے باتیں کر لیا کروں گی۔ جب فرصت ملے مجھے ادھر ادھر کی خبریں سنا دینا۔ بس یہ سمجھو کہ تم میری پرائیویٹ سیکرٹری ہو۔

یہ کہہ کر جانہوی چلی گئی۔صوفی کا دل ہلکا ہوگیا۔اس کو بڑی فکر تھی کہ اندو کے چلے جانے پر یہاں میں کیسے رہوں گی۔کون میری بات پوچھے گا، نا خواندہ مہمان کی طرح پڑی رہوں گی۔یہ اندیشہ جاتا رہا۔

اس دن سے اس کی اور خاطر مدارت ہونے لگی۔لونڈیاں اس کا منہ دیکھتی رہتیں۔بار بار آ کر پوچھ جاتیں۔''مس صاحبہ! کوئی کام تو نہیں ہے۔'' کوچوان دونوں وقت دریافت کرتا۔''حکم ہوتو گاڑی تیار کروں۔'' رانی جی بھی دن میں ایک بار ضرور آ کر بیٹھ جاتیں۔صوفی کو اب معلوم ہوا کہ ان کا دل استری جاتی کے ساتھ بھلائی کرنے والے جذبات سے کس قدر معمور تھا۔انہیں ہندوستان کی دیویوں کو اینٹ اور پتھر کے سامنے سر جھکاتے دیکھ کر دلی رنج ہوتا تھا۔وہ ان کی مادہ پرستی، وہم پرستی اور خود پرستی کو ملکی زوال کا خاص سبب سمجھتی تھیں۔ان امور پر صوفی سے گھنٹوں گفتگو کیا کرتیں۔ اس مہربانی و محبت نے آہستہ آہستہ صوفی کے دل سے مغائرت کے خیالات کو مٹانا شروع کیا۔اس کے خیالات و اطوار میں تغیر ہونے لگا۔لونڈیوں سے کچھ کہتے ہوئے اب ہچک نہ ہوتی۔مکان کے کسی حصہ میں جاتے ہوئے اب تامل نہ ہوتا، لیکن تفکرات میں جوں جوں کمی ہوتی تھی عیش پسندی میں اضافہ ہو رہا تھا۔اس کی فراغت کے اوقات میں ترقی ہونے لگی۔تفریح سے رغبت پیدا ہوئی۔کبھی مصوران قدیم کی تصاویر دیکھتی۔کبھی باغ کی سیر کرنے چلی جاتی۔کبھی پیانو پر جا بیٹھی۔یہاں تک کہ کبھی کبھی رانی کے ساتھ شطرنج بھی کھیلنے لگی۔زیورات اور کپڑوں کی طرف سے اب بے پروائی نہ رہی۔گاؤن کے بدلے ریشمی ساڑھیاں پہننے لگی۔رانی جی کے اصرار سے کبھی کبھی پان بھی کھا لیتی۔کنگھی چوٹی سے انس ہوا۔فکر بے تعلقی پیدا کرتی ہے۔بے فکری کا کھیل تماشے سے میل ہے۔

ایک روز تیسرے پہر وہ اپنے کمرہ میں بیٹھی کچھ پڑھ رہی تھی۔گرمی اتنی سخت تھی کہ برقی پنکھوں اور خس کی ٹٹیوں کے ہوتے ہوئے بھی بدن سے پسینہ نکل رہا تھا۔

باہر لو سے جسم جھلسا جاتا تھا۔ دفعتاً پربھوسیوک آ کر بولے۔ ''صوفی! ذرا چل کر ایک جھگڑے کا تصفیہ کر دو۔ میں نے ایک نظم لکھی ہے۔ ونے سنگھ کو اس کے متعلق کئی شکوک ہیں۔ میں کچھ کہتا ہوں۔ وہ کچھ کہتے ہیں۔ فیصلہ تمہارے اوپر چھوڑا گیا ہے ذرا چلو۔''

صوفی: میں شاعری نزع کا کیا فیصلہ کروں گی۔ عروض سے ذرا بھی واقفیت نہیں اور نہ استعارات کا کوئی علم ہے۔ مجھے بے فائدے لے جاتے ہو۔

پربھوسیوک: اس نزع کا فیصلہ کرنے کے لیے عروض جاننے کی ضرورت نہیں۔ میرے اور ان کے معیار میں اختلاف ہے۔ چلو تو۔

صوفی صحن میں آئی تو بدن میں لپٹ سی لگی۔ تیزی سے قدم اٹھاتے ہوئے ونے کے کمرہ میں گئی جو محل کے دوسرے حصہ میں تھا۔ آج تک وہ یہاں کبھی نہ آئی تھی۔ کمرہ میں کوئی سامان نہ تھا۔ صرف ایک کمبل بچھا ہوا تھا اور زمین ہی پر دس پانچ کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ نہ پنکھا، نہ خس کی ٹٹی، نہ پردے، نہ تصویریں، پچھوا ہوا سیدھی کمرہ میں آتی تھی۔ کمرہ کی دیواریں جلتے توے کی طرح تپ رہی تھیں۔ وہیں ونے سر جھکائے کمبل پر بیٹھے ہوئے تھے۔ صوفی کو دیکھتے ہی وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور کرسی لانے دوڑے۔

صوفی: کہاں جا رہے ہیں؟

پربھوسیوک: (مسکرا کر) تمہارے لیے کرسی لانے۔

صوفی: وہ کرسی لائیں گے اور میں بیٹھوں گی۔ کتنی بھدی بات ہے۔

پربھوسیوک: میں روکتا بھی تو وہ نہ مانتے۔

صوفی: اس کمرہ میں ان سے کیسے رہا جاتا ہے؟

پربھوسیوک: پورے جوگی ہیں۔ میں تو دلی محبت کے سبب آ جایا کرتا ہوں۔

اتنے میں ونے نے گدے دار کرسی لا کر صوفی کے لیے رکھ دی۔ صوفی شرم اور

تامل سے گڑی جاتی تھی۔ ونے کی ایسی حالت تھی گویا پانی میں بھیگ رہے ہیں۔ صوفی دل میں کہتی تھی۔ ''کیسی اعلیٰ زندگی ہے۔'' ونے دل میں کہتے تھے۔ ''کیسا بے مثال حسن ہے۔'' دونوں اپنی اپنی جگہ کھڑے رہے۔ آخر ونے کو ایک بات سوجھی۔ پربھوسیوک کی طرف دیکھ کر بولے۔ ''ہم اور تم فریق مقدمہ ہیں۔ پس کھڑے رہ سکتے ہیں، لیکن حاکم کو اونچے مقام پر بیٹھنا ہی مناسب ہے۔''

صوفی نے پربھوسیوک کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''کھیل میں لڑکا اپنے کو بھول نہیں جاتا۔''

بالآخر ہر سہ اشخاص کمبل ہی پر بیٹھے۔ پربھوسیوک نے اپنی نظم پڑھ کر سنائی۔ نظم حلاوت میں ڈوبی ہوئی، پاکیزہ اور بلند جذبات سے مملو تھی۔ شاعر نے نظم میں شعریت کوٹ کوٹ کر بھر دی تھی۔ عنوان تھا۔ ''ایک ماں کا اپنی بیٹی کو دعا دینا۔'' بیٹی سسرال جا رہی ہے۔ ماں اس کو گلے لگا کر دعا دیتی ہے۔ بیٹی تو شوہر پرست ہو۔ تیری گود پھلے۔ اس میں پھول جیسے نازک بچے کھیلیں۔ ان کے شیریں قہقہوں سے تیرا گھر اور صحن گونجے۔ تجھ پر لچھمی کا کرم ہو، تو پتھر بھی چھوئے تو سونا ہو جائے۔ تیرا شوہر تجھ پر اسی طرح محبت کا سایہ رکھے جس طرح چھپر دیوار کو اپنے سایہ میں رکھتا ہے۔''

شاعر نے انہیں خیالات میں شادی شدہ زندگی کی ایسی دل کش تصویر کھینچی تھی کہ اس میں پھولوں کی روشنی اور محبت کی کثرت تھی۔ کہیں بھی وہ تاریک گھاٹیاں نہ تھیں، جن میں ہم گر پڑتے ہیں۔ کہیں بھی وہ کانٹے نہ تھے جو ہمارے پیروں میں چبھتے ہیں۔ کہیں بھی وہ نقص نہ تھا جو ہم کو راستہ سے ہٹا دیتا ہے۔ نظم ختم کر کے پربھوسیوک نے ونے سنگھ سے کہا ''اب آپ کو اس کے بارے میں جو کچھ کہنا ہو کہیے۔''

ونے سنگھ نے تامل کے ساتھ جواب دیا۔ ''مجھے جو کچھ کہنا تھا کہہ چکا۔''

پربھوسیوک: پھر سے کہیے۔

ونے سنگھ: بار بار وہی باتیں کیا کہوں۔

پربھوسیوک: میں آپ کے کہنے کا خلاصہ بیان کر دوں۔

ونے سنگھ: میرے دل میں ایک بات آئی کہہ دی۔ آپ بے فائدہ اسے اتنا طول دے رہے ہیں۔

پربھوسیوک: آخر آپ ان جذبات کو صوفی کے سامنے ظاہر کرتے ہوئے کیوں شرماتے ہیں؟

ونے سنگھ: شرماتا نہیں ہوں لیکن میرا آپ کے ساتھ کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ آپ کو انسانی زندگی کا یہ معیار بہترین معلوم ہوتا ہے۔ مجھے وہ اپنی موجودہ حالت کے خلاف جچتا ہے۔ اس میں جھگڑے کی کوئی بات نہیں ہے۔

پربھوسیوک: (ہنس کر) ہاں یہی تو میں آپ سے کہلانا چاہتا ہوں کہ آپ اس کو موجودہ حالت کے خلاف کیوں سمجھتے ہیں؟ کیا آپ کے خیال میں شادی شدہ زندگی بالکل حقیر ہے اور کیا دنیا کے کل آدمیوں کو سنیاس لے لینا چاہیے؟

ونے سنگھ: میرا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ دنیا کے کل آدمیوں کو سنیاس لے لینا چاہیے۔ میرا مطلب صرف یہ تھا کہ ایسی زندگی خودغرضی کے بڑھانے والی ہے۔ اس کے ثبوت کی ضرورت نہیں اور اس کے انحطاط کی حالت میں جب کہ خودغرضی ہماری رگوں میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے، جب کہ ہم اپنی غرض کے بغیر کوئی بات یا کوئی کام نہیں کرتے۔ یہاں تک کہ ماں بیٹے کے تعلق میں، استاد شاگرد کے تعلق میں، زن شوہر کے تعلق میں خودغرضی کا خاص جزو ہے۔ تو ایسا ہوتے ہوئے کسی بلند پایہ شاعر کے لیے اس کی زندگی کی سراہنا کرنا، اس کی تعریفوں کے پل باندھنا، زیب نہیں دیتا۔ ہم اس کی زندگی سے پیدا ہونے والے سکھوں کے غلام ہو رہے ہیں۔ ہم نے اسی کو اپنی زندگی کا معیار سمجھ رکھا ہے! اس وقت ہم کو ایسے وفا شعار، ایثار نفس اور بے غرض کام کرنے والوں کی ضرورت ہے جو قومی اصلاح کے لیے اپنی

جان تک قربان کر دیں۔ ہمارے شعرا کو ایسے ہی پاک اور بلند جذبات کو متحرک کرنا چاہیے۔ ہمارے ملک کی آبادی ضرورت سے زیادہ ہوگئی ہے۔ ہماری بھارت ماتا افزونی نسل کے بار کو اب نہیں سنبھال سکتی۔ اسکولوں میں، سڑکوں پر، گلیوں میں اب اتنے لڑکے نظر آتے ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کریں گے۔ ہمارے ملک میں اتنی پیداوار بھی نہیں ہوتی کہ سب کو ایک بار بھی حسب مرضی خوراک مل سکے۔ خوراک کا ملنا ہی ہمارے اخلاقی اور اقتصادی انحطاط کا خاص سبب ہے۔ آپ کی نظم بالکل بے موقع ہے۔ میرے خیال میں اس سے سوسائٹی کا بھلا نہیں ہوسکتا۔ اس وقت ہمارے شعرا کا فرض ہے ایثار کی اہمیت دکھلانا، تجرد کی لگن پیدا کرنا، دل پر قابو رکھنے کی تلقین کرنا، شادی شدہ زندگی تو غلامی کی جڑ ہے اور یہ وقت اس کی ثنا خوانی کے لیے موزوں نہیں ہے۔

پربھوسیوک: آپ کو جو کچھ کہنا تھا کہہ چکے؟

ونے سنگھ: ابھی بہت کچھ کہا جا سکتا ہے، لیکن اس وقت اتنا ہی کافی ہے۔

پربھوسیوک: میں آپ سے پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ ایثار اور قربانی کے معیار کی میں برائی نہیں کرتا۔ وہ انسانوں کے لیے سب سے اونچا درجہ ہے اور وہ شخص بلاشبہ قابل تحسین ہے جو اس کو حاصل کر لے لیکن جس طرح کچھ برت کرنے والوں کے بلا کھائے پیے رہنے سے کھانے اور پانی کی فائدہ رسانی میں کوئی نقص نہیں آتا۔ اسی طرح دو چار جوگیوں کے تارک الدنیا ہو جانے سے شادی شدہ زندگی قابل ترک نہیں ہو جاتی۔ یہ زندگی انسان کی جماعتی زندگی کی جڑ ہے۔ اس کو ترک کر دیجیے بس ہمارے جماعتی اتحاد کا شیرازہ منتشر ہو جائے گا اور ہماری حالت جانوروں کی سی ہو جائے گی۔ رشیوں نے گرہستی کو بہترین دھرم کہا ہے اور اگر ٹھنڈے دل سے غور کیجیے تو ظاہر ہو جائے گا کہ رشیوں کا یہ کہنا ذرا بھی مبالغہ آمیز نہیں ہے۔ رحم، ہمدردی، تحمل، فیاضی، ایثار وغیرہ اعلیٰ اوصاف کی ترقیوں کے جیسے موقعے آشرم میں ملتے ہیں۔ وہ

اور کسی آشرم میں نہیں مل سکتے۔ مجھے تو یہاں تک کہنے میں تامل نہیں ہے کہ انسان کے لیے یہی ایک ایسا دھرم ہے جو فطرتی کہا جا سکتا ہے۔ جن کارناموں نے انسانی قومیت کے چہرہ کو جلا بخشی ہے، ان کا سہرا جوگیوں کے نہیں بلکہ گرہست زندگی کا سکھ بھوگنے والوں کے سر ہے۔ ہری چندر جوگی نہیں تھا۔ رام چندر جوگی نہیں تھے۔ کرشن تارک الدنیا نہیں تھے۔ نپولین تارک الدنیا نہیں تھا۔ نیوٹن جوگی نہیں تھا۔ مذہب اور علم کے میدان عمل بھوگیوں نے ضرور شہرت حاصل کی ہے لیکن میدان عمل میں شہرت کا سہرا بھوگیوں کے سر بندھا ہے۔ تاریخ میں ایسا ایک بھی ثبوت نہیں ملتا کہ کسی قوم کی نجات تیاگیوں کے ذریعہ ہوئی ہو۔ آج بھی ہندوستان میں دس لاکھ سے زیادہ تیاگی بستے ہیں، پر کون کہہ سکتا ہے کہ ان سے سوسائٹی کو کچھ فائدہ پہنچ رہا ہے۔ ممکن ہے پوشیدہ طریقہ پر ایسا ہوتا ہو، لیکن ظاہرا تو نہیں دکھائی دیتا۔ پھر یہ امید کیوں کر کی جا سکتی ہے کہ گرہستی سے بچنے میں قوم کا کوئی خاص فائدہ ہوگا۔ ہاں اگر کم فہمی کو آپ فائدہ سمجھتے ہو تو ضرور ہوگا۔

یہ گفتگو ختم کر کے پربھوسیوک نے صوفیہ سے کہا۔ ’’تم نے فریقین کی باتیں سن لیں۔ تم اس عدل گستری کی جگہ پر ہو، سچ جھوٹ کا فیصلہ کرو۔‘‘

صوفی: اس کا فیصلہ تو تم آپ ہی کر سکتے ہو۔ تمہاری سمجھ میں گانا تو بہت اچھی چیز لگتی ہے؟

پربھوسیوک: ضرور۔

صوفی: لیکن اگر کسی گھر میں آگ لگی ہوئی ہو تو وہاں رہنے والوں کو گاتے بجاتے دیکھ کر تم کیا کہو گے؟

پربھوسیوک: بیوقوف کہوں گا اور کیا۔

صوفی: کیوں؟ گانا تو کوئی بری چیز نہیں؟

پربھوسیوک: تو یہ صاف صاف کیوں نہیں کہتیں کہ تم نے انہیں ڈگری دے دی۔

میں پہلے ہی سمجھ رہا تھا کہ تم انہیں کی طرف جھکو گی۔

صوفی: اگر یہ اندیشہ تھا، پھر تم نے مجھے پنچ کیوں بنایا تھا۔ تمہاری نظم نہایت اعلیٰ پایہ کی ہے۔ میں اس کو سراپا دل کش کہنے کے لیے تیار ہوں لیکن تمہارا یہ فرض ہے کہ اپنی اس روحانی طاقت سے برادران وطن کو فائدہ پہنچاؤ۔ زوال کے حسن و عشق کا راگ الاپنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اسے تم بھی قبول کرو گے۔ معمولی شعرا کے لیے کوئی قید نہیں ہے۔ ان پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے، لیکن تم کو ایشور نے جتنی ہی خاص قدرت عطا کی ہے، تمہارے اوپر ذمہ داری بھی اتنی ہی زیادہ ہے۔

جب صوفیہ چلی گئی تو ونے نے پربھوسیوک سے کہا: ''میں اس فیصلہ کو پہلے ہی معلوم کر چکا تھا۔ تم نادم تو نہ ہوئے ہوگے؟''

پربھوسیوک: اس نے تمہاری مروت کی ہے۔

ونے: بھائی! تم بڑے بے انصاف ہو۔ اس قدر مدلل فیصلہ پر بھی ان کے سر الزام ہی عاید کر دیا۔ میں تو ان کی پختہ خیالی کا پیشتر ہی سے قائل تھا۔ آج سے معتقد ہو گیا۔ اس فیصلہ نے میری قسمت کا فیصلہ کر دیا۔ پربھو! مجھے خواب مین بھی یہ امید نہ تھی کہ میں اتنی آسانی سے خواہشات کا غلام بن جاؤں گا۔ میں راستہ سے ہٹ گیا۔ میرا ضبط کسی بنے ہوئے دوست کی طرح امتحان کے اول ہی موقع پر میرا ساتھ چھوڑ گیا۔ میں خوب جانتا ہوں کہ میں آسمان کے تارے توڑنے جا رہا ہوں۔ وہ پھل کھانے جا رہا ہوں جو میرے لیے ممنوع ہے۔ خوب جانتا ہوں پربھو! کہ میں اپنی زندگی کو مایوسی کی بیدی پر قربان کر رہا ہوں۔ اپنی والدہ محترمہ کے دل پر کلہاڑے چلا رہا ہوں۔ اپنی عزت و آبرو کی کشتی کو ذلت اور رسوائی کے سمندر میں ڈبو رہا ہوں۔ اپنی عظمت کی خواہشات کا خاتمہ کر رہا ہوں لیکن میرا دل اس کے لیے مجھے ملامت نہیں کرتا۔ صوفیہ کسی طرح میری نہیں ہو سکتی لیکن میں اس کا ہو چکا اور تمام عمر اسی کا رہوں گا۔

پربھو: ونے! اگر صوفی کو یہ بات معلوم ہوگئی تو وہ یہاں ایک منٹ بھی نہ رہے گی۔ کہیں وہ خودکشی نہ کرلے۔ خدا کے لیے ایسا کام نہ کرو۔

ونے سنگھ: نہیں پربھو! میں بہت جلد یہاں سے جاؤں گا اور پھر کبھی نہ آؤں گا۔ میرا دل جل کر خاک سیاہ ہوجائے مگر صوفی کو آنچ بھی نہ لگنے پائے گی۔ میں کسی دور مقام میں بیٹھا ہوا اس علم، دانائی اور پاکیزگی کی دیوی کی پرستش کیا کروں گا۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرے عشق میں نفسانیت کا شائبہ بھی نہیں۔ میری زندگی کو بامعنی بنانے کے لیے یہ محبت ہی کافی ہے۔ یہ مت سمجھو کہ میں اپنی ملکی خدمت کے کام کو ترک کر رہا ہوں۔ نہیں ایسا نہ ہوگا۔ میں اب بھی اسی راستہ پر چلتا رہوں گا۔ فرق صرف اتنا ہوگا کہ غیر مجسم کی جگہ، مجسم کی نہ دکھائی دینے والے کی جگہ، دکھائی دینے والے کی پوجا اور بھگتی کروں گا۔

اسی وقت جانہوی نے دفعتاً آ کر کہا۔ ''ونے! ذرا اندو کے پاس چلے جاؤ۔ کئی روز سے اس کا کچھ حال نہیں ملا۔ مجھے اندیشہ ہو رہا ہے کہ کہیں بیمار تو نہیں ہوگئی۔ خط بھیجنے میں اتنی دیر تو کبھی نہ کرتی تھی۔''

ونے تیار ہو گئے۔ کرتہ پہنا۔ ہاتھ میں سونٹا لیا اور چل دیئے..... پربھو سیوک صوفی کے پاس جا کر بیٹھ گئے اور سوچنے لگے۔ ونے سنگھ کی باتیں اس سے کہوں یا نہ کہوں۔ صوفی نے انہیں متفکر دیکھ کر پوچھا: ''کنور صاحب کچھ کہتے تھے؟''

پربھو سیوک: اس بارے میں تو کچھ نہیں کہتے تھے، مگر تمہارے بارے میں ایسے خیالات کا اظہار کیا جن کا مجھے وہم و گمان بھی نہ تھا۔

صوفی نے لمحہ بھر زمین تاکنے کے بعد کہا۔ ''میں سمجھتی ہوں۔ پہلے ہی سمجھ جانا چاہیے تھا، مگر میں اس سے پریشان نہیں ہوں۔ یہ جذبہ میرے دل میں اس وقت پیدا ہوا جب یہاں آنے کے چوتھے روز میں نے آنکھیں کھولیں اور نیم بیہوشی کی حالت میں ایک فرشتہ صورت انسان کو سامنے کھڑا ہوا اور اپنی طرف محبت آمیز

نگاہوں سے دیکھتا ہوا پایا۔ وہ صورت اور وہ نگاہ آج تک میرے دل پر منقوش ہے اور ہمیشہ منقوش رہے گی۔

پربھوسیوک: صوفی! تمہیں یہ کہتے شرم نہیں آتی؟

صوفی: نہیں۔ شرم نہیں آتی۔ شرم کی بات ہی نہیں ہے۔ وہ مجھے اپنے عشق کے قابل سمجھتے ہیں۔ یہ میرے لیے فخر کی بات ہے۔ ایسے درویش سیرت، ایسے ایثار مجسم، ایسے حوصلہ مند شخص کی معشوقہ بننے میں کوئی شرم نہیں ہے۔ اگر عشق کا تحفہ پا کر کسی نوجوان دوشیزہ کو فخر ہو سکتا ہے تو وہ دوشیزہ میں ہوں۔ یہی برکت تھی جس کے حصول کے لیے میں اتنے دنوں تک صبر و استقلال کی تپسیا کر رہی تھی۔ آج اسی برکت کا مجھ پر نزول ہوا ہے تو یہ میرے لیے شرم کی بات نہیں بلکہ خوشی کی بات ہے۔

پربھوسیوک: مذہبی تضاد ہوتے ہوئے بھی؟

صوفیہ: اس کا خیال وہ لوگ کرتے ہیں جن کا عشق خواہشات نفسانی پر مشتمل ہے۔ عشق اور خواہش میں اتنا ہی فرق ہے، جتنا کہ سونا اور کانچ (شیشہ) میں۔ عشق اعتقاد کے مشابہ ہے۔ دونوں میں صرف کمی بیشی کا فرق ہے۔ اعتقاد میں عزت اور عشق میں خدمت والے جذبات کی فراوانی ہوتی ہے۔ عشق کے لیے مذہبی تضاد کوئی رکاوٹ نہیں پیدا کرتا ہے، ایسی رکاوٹ اس ارادہ کے لیے جس کا نتیجہ شادی ہے نہ کہ اس عشق کے لیے جس کا نتیجہ قربانی ہے۔

پربھوسیوک: میں نے تمہیں جتا دیا۔ یہاں سے چلنے کے لیے تیار رہو۔

صوفیہ: مگر گھر پر کسی سے اس کا چرچا کرنے کی ضرورت نہیں۔

پربھوسیوک: اس سے بےفکر رہو۔

صوفیہ: کچھ طے ہوا۔ یہاں سے ان کے جانے کا کب قصد ہے؟

پربھوسیوک: تیاریاں ہو رہی ہیں۔ رانی جی کو یہ بات معلوم ہوئی تو وہ نے کی خیر نہیں۔ مجھے تعجب نہ ہوگا اگر ماما سے اس کی شکایت کریں۔

صوفیہ نے غرور سے سر اٹھا کر کہا۔ ''پربھو! کیسی بچوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ عشق بے خودی کا منتر ہے۔ عشق کی پرستش کرنے والا دنیا کے سبھی تفکرات اور بندشوں سے آزاد ہو جاتا ہے۔''

پربھو سیوک چلے گئے تو صوفیہ نے کتاب بند کر دی اور باغ میں جا کر ہری گھاس پر لیٹ گئی۔ اس کو آج کھلے ہوئے پھولوں میں، آہستہ آہستہ چلنے والی ہوا میں، درختوں پر چہکنے والی چڑیوں کی آواز میں، آسمان کی سرخی میں، ایک عجیب رونق، ایک ناقابل بیان خوبصورتی، ایک روحانی جلوہ کا سماں نظر آتا تھا۔ وہ عشق کا انمول موتی پا گئی۔

ایک ہفتہ ہو گیا مگر ونے سنگھ نے راجپوتانہ کا سفر نہ کیا۔ وہ کسی نہ کسی بہانہ سے دن ٹالتے جاتے تھے۔ کوئی تیاری نہ کرنی تھی۔ پھر بھی تیاریاں پوری نہ ہوتی تھیں۔ اب ونے اور صوفیہ دونوں ہی کو معلوم ہونے لگا کہ عشق کو جب کہ وہ عورت اور مرد دونوں ہی میں ہو، خواہشات نفسانی سے مبرا رکھنا اتنا آسان نہیں ہے، جتنا انہوں نے سمجھا تھا۔ صوفی ایک کتاب بغل میں دبا کر علی الصبح باغ میں جا بیٹھتی۔ شام کو بھی کہیں اور جگہ سیر کرنے نہ جا کر وہیں چلی جاتی۔ ونے بھی اس سے کچھ فاصلہ پر لکھتے پڑھتے کتے سے کھیلتے یا کسی دوست سے باتیں کرتے ضرور دکھائی دیتے۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف دزدیدہ نگاہوں سے دیکھ لیتے تھے، پر شرم کے سبب کوئی بات چیت کرنے میں پیش قدمی نہ کرتا تھا۔ دونوں ہی حیادار تھے۔ پر دونوں ہی اس خاموش بیانی کا مطلب سمجھتے تھے۔ پہلے اس زبان کا علم نہ تھا۔ دونوں کے دل میں ایک ہی خواہش، ایک ہی بے قراری، ایک ہی تڑپ، ایک ہی آگ تھی۔ خاموش بیانی سے انہیں تسکین نہ ہوتی، لیکن کسی کو گفتگو کرنے کی کچھ جرأت نہ ہوتی۔ دونوں اپنے اپنے دلوں میں عشقیہ گفتگو کی نئی نئی باتیں سوچ کر آتے اور وہاں جا کر سب بھول جاتے۔ دونوں ہی عہد کے پکے اور معیار کے پجاری تھے، لیکن ایک کاندھی

کتابوں کی طرف دیکھنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ دوسرا سمتی کو اپنے مجوزہ مضامین پر تقریر سنانے کا موقع بھی نہ پاتا تھا۔ دونوں ہی کے لیے عشق کا موتی عشق کا نشہ ثابت ہو رہا تھا۔

ایک روز رات کو کھانا کھانے کے بعد صوفیہ رانی جی کے پاس بیٹھی ہوئی کوئی اخبار پڑھ کر سنا رہی تھی کہ ونے سنگھ آ کر بیٹھ گئے۔ صوفی کی عجیب حالت ہو گئی۔ پڑھتے پڑھتے بھول جاتی کہ کہاں تک پڑھ گئی ہوں اور پڑھی ہوئی سطروں کو دوبارہ پڑھنے لگتی۔ وہ بھی اٹک اٹک کر الفاظ پر نظر نہ جمتی۔ وہ بھول جانا چاہتی تھی کہ کمرہ میں رانی کے علاوہ کوئی اور شخص بیٹھا ہوا ہے مگر ونے کی طرف دیکھے بغیر ہی اس کو غائبانہ علم سا ہو جاتا تھا کہ اب وہ میری طرف دیکھ رہے ہیں اور فوراً ہی اس کا دل بے قابو ہو جاتا تھا۔ جانہوی نے کئی بار ٹوکا۔ ''سوتی تو نہیں ہو؟ کیا بات ہے؟ رک کیوں جاتی ہو؟ آج تمہیں کیا ہو گیا ہے بٹی؟'' دفعتاً ان کی نگاہ ونے سنگھ پر پڑی۔ اسی وقت جب وہ عاشقانہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ جانہوی کا شگفتہ اور مطمئن چہرہ تمتما اٹھا۔ گویا باغ میں آگ لگ گئی۔ تیز نگاہی سے ونے سنگھ کی طرف دیکھ کر بولی۔ ''تم کب جا رہے ہو؟''

ونے: بہت جلد۔

جانہوی: میں بہت جلد کا مطلب یہ سمجھتی ہوں کہ تم کل ہی علی الصبح روانہ ہو جاؤ گے۔

ونے: ابھی ساتھ جانے والے چند آدمی باہر گئے ہوئے ہیں۔

جانہوی: کوئی ہرج نہیں۔ وہ پیچھے سے چلے جائیں گے۔ تمہیں کل ہی جانا ہوگا۔

ونے: جو ارشاد۔

جانہوی: ابھی جا کر سب آدمیوں کو اطلاع دے دو۔ میں چاہتی ہوں کہ تم لوگ طلوع آفتاب کے وقت اسٹیشن پر پہنچ جاؤ۔